ڈاکٹر محمد ایوب قادری

# حضرت مجدد کی تحریک کا تاریخی پس منظر

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ ۹۷۱ھ (۶۴-۱۵۶۳ء) میں پیدا ہوئے۔ ۶۳ سال کی عمر میں ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ (۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ء) کو ان کا انتقال ہوا۔ برصغیر کی تاریخ میں سیاسی اعتبار سے یہ ساٹھ ستر سال یعنی سولھویں صدی کا ثلث آخر اور سترھویں صدی کا ربع اول خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس دور کی نمایاں خصوصیات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہمارے سامنے ایک دلچسپ تصویر آتی ہے۔ مسلمانوں کو یہاں آئے ہوئے کم و بیش سات سو سال سے زیادہ گزر چکے تھے۔ یہاں انھوں نے ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی جو چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں اپنے انتہائی کمال کو پہنچ چکی تھی اور اس کا اقتدار سارے برصغیر کو محیط تھا۔ اس سلطنت کا صدر مقام دہلی تھا، جو اپنی وسعت، شان و شوکت اور دل ربائی میں سمرقند و بخارا کا ہم سر تھا اور اسلامی تہذیب کے اعلیٰ مراکز میں شمار کیا جاتا تھا۔

سلطنتِ دہلی کا عروج کم و بیش دو سو سال رہا اور پھر انحطاط شروع ہوا۔ اس نے بھی کافی وقت لیا اور برصغیر کے مختلف حصوں میں علاقائی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی اقتدار و مرکزیت دورِ انحطاط سے خاصی متاثر ہوئی، لیکن مسلمانوں کی معاشرتی و ثقافتی زندگی کا شیرازہ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات اور اخوت و مساوات کے اصولوں کی بدولت قائم رہا۔ اس شیرازہ بندی کے قیام و استحکام میں ہمارے دینی رہنماؤں خصوصاً مشائخ و صوفیہ نے نمایاں کردار ادا کیا۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ سولھویں صدی کے شروع میں برصغیر کے سیاسی نقشے میں مختلف ہلکے اور گہرے رنگ تھے۔ اس پر ایک سرسری نظر ڈالیے، سلطنتِ دہلی اس وقت بھی سب سے نمایاں نظر آتی ہے۔ دہلی کے شمال و مغرب میں سندھ کو چھوڑ کر وہ سارا علاقہ جو آج پاکستان میں شامل ہے، نیز بھارت کا صوبہ مشرقی پنجاب اسی سلطنت میں نظر آتا ہے۔ مشرق میں روہیل کھنڈ

اور اودھ کے علاقے تھے ۔ گویا کہ موجودہ صوبہ اتر پردیش بھی سلطنت دہلی ہی کے زیر نگیں تھا۔
اس سلطنت کے علاوہ جن دوسری حکومتوں پر ہماری نظر پڑتی ہے، ان میں قابلِ ذکر یہ ہیں۔ شمال میں کشمیر کی پہاڑی ریاست نمایاں طور پر نظر آرہی ہے ۔ برصغیر کے مشرقی علاقے میں بنگال و بہار کی علیحدہ علیحدہ ریاستیں موجود ہیں۔ مغرب کی طرف دیکھو تو سندھ، گجرات اور مالوہ کی حکومتیں نظر آئیں گی۔ جنوب میں ایک وسیع اور شاندار سلطنت قائم تھی جو اپنے بانی کے نام پر بہمنی سلطنت کہلاتی تھی۔

اس وقت ہم کو اس کی تاریخ اور تمدنی حالت کی طرف توجہ کرنی مقصود نہیں، لیکن یہ یاد رکھیے کہ سلطنت دہلی پر لودی پٹھانوں کا ایک خاندان حکمرانی کر رہا ہے ۔ اس خاندان کا آخری سلطان ابراہیم لودی، اپنی تہی مغزی، خود رائی اور غرور و پندار کی وجہ سے خود اپنے اراکین سلطنت میں نامقبول تھا۔ چنانچہ خود اس کے سر برآوردہ امیر نے قاصد بھیج کر کابل سے بابر بادشاہ کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔

بابر چغتائی ترکوں کے مشہور فاتح امیر تیمور گورگانی کی اولاد میں چھٹی پشت میں تھا۔ وہ اپنے باپ عمر شیخ مرزا کے مرنے کے بعد دس بارہ سال تک غیر معمولی مصائب کا مقابلہ کرتا رہا اور آخرکار کابل کا حکمران تسلیم کر لیا گیا۔ ہندی امرا کی دعوت ملنے پر اس کے شوقِ فتوحات میں ایک نیا جوش پیدا ہوا ۔ ۱۵۲۶ء میں بابر اور ابراہیم لودی کے درمیان پانی پت کے میدان میں ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی، جس میں بابر فتح یاب ہوا اور مغلیہ سلطنت کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد بابر صرف چار سال زندہ رہا لیکن اس عرصے میں اس کو دو لڑائیاں اور لڑنی پڑیں۔

اس کے بیٹے اور جانشین ہمایوں کو دس سال تک مغلیہ سلطنت کے مخالفین سے نبرد آزما ہونا پڑا ۔ ۱۵۴۰ء میں اس نے شیر شاہ سے شکست کھائی اور وہ جان بچا کر ایران چلا گیا ۔ اگرچہ شاہِ ایران کی مدد سے اس کو اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی مگر ایرانیوں کے عمل دخل اور افکار و خیالات سے نئے شگوفے پھوٹے جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔

ہمایوں ۱۵۵۵ء میں شمال مغربی علاقوں کو فتح کر کے دہلی آگیا، لیکن اس کو آئے ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ وہ زینے سے گر کر فوت ہوگیا۔

ہمایوں کا جانشین جلال الدین محمد اکبر اس وقت تیرہ سال کا لڑکا تھا۔ اس کے اتالیق بیرم خاں نے بغیر وقت ضائع کیے ہوئے، اس کی تخت نشینی کی رسم ادا کی۔ اکبر نے پچاس سال یعنی ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک حکومت کی۔ جنگی فتوحات، توسیع سلطنت اور نظم حکومت کی اصلاح کے سلسلے میں اس کے کارنامے نمایاں ہیں اور اسی وجہ سے اس کو اکبر اعظم کہا گیا ہے۔ اس کی فتوحات اور انتظامی اصلاحات کا یہاں ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

تخت نشینی کے چند ماہ بعد ہی اکبر کو اپنی ابتدائی دور کی سب سے اہم جنگ لڑنی پڑی۔ عادل شاہ سوری چنار میں بیٹھا ہوا تھا، اس کا ایک ہندو سردار ہیمو بقال ایک بڑی فوج لے کر آیا۔ دہلی کو فتح کر کے وہ آگے بڑھا اور پانی پت کے میدان میں مغلوں اور پٹھانوں کی دوسری فیصلہ کن جنگ ہوئی، جس میں ہیمو کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہو کر قتل ہوا۔ چار سال بعد مالوہ فتح ہوا اور شاملِ سلطنت ہوگیا۔ یہاں چھوٹی چھوٹی فتوحات کا ذکر ممکن نہیں، لیکن یہ یقینی ہے کہ اب اکبر نے توسیع سلطنت کا تہیہ کر لیا تھا۔ چنانچہ راجپوتانہ کی کئی ریاستوں نے مغلوں کا اقتدار تسلیم کر لیا، لیکن چتوڑ کے خلاف اکبر کو باقاعدہ جنگ کرنی پڑی۔ چتوڑ فتح ہوا، ہزارہا راجپوت تہ تیغ ہوئے اور کثیر التعداد نے آگ میں جل کر جوہر کی رسم ادا کی۔

چتوڑ فتح ہونے کے پانچ سال بعد اکبر نے گجرات پر حملہ کیا اور ۱۵۷۳ء میں اس کو بھی سلطنتِ مغلیہ میں شامل کر لیا گیا۔ دو سال بعد بنگال فتح ہوا۔ آئندہ دس سال میں اکبر نے بعض ایسے اقدامات کیے جن کے اہم نتائج برآمد ہوئے۔ فتوحات کے سلسلے میں کشمیر کا ذکر ضروری ہے، جو ۱۵۸۶ء میں فتح ہوا۔ اب شمالی ہندوستان مکمل طور پر فتح ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اکبر نے دکن کی طرف توجہ کی۔ آٹھ دس سال کی کوششوں کے نتیجے میں برار، خاندیش اور احمد نگر کے علاقے فتح ہو کر مغلیہ سلطنت کے صوبے بن گئے۔ قندھار کے ایرانی گورنر نے ۱۵۹۵ء میں اپنا علاقہ خود ہی مغلوں کو دے دیا۔

فتوحات کا یہ ایسا ریکارڈ ہے کہ اس پر ہر حکمران فخر کر سکتا ہے۔ اکبر نے انتظامِ حکومت کے سلسلے میں بھی بہت سی اصلاحات نافذ کیں، سلطنت کو پندرہ صوبوں میں تقسیم کر کے گورنر یا صوبے دار مقرر کیے۔ شیر شاہ کا قائم کیا ہوا سرکاروں یا ضلعوں کا طریقہ باقی رکھا۔ فوج میں منصب داری

کا ضابطہ جاری کیا - زمین کی پیمائش کرائی اور باقاعدہ لگان مقرر کیا - ان اصلاحات کا یہ نتیجہ ہوا کہ مغلیہ سلطنت نہایت مستحکم اور پائیدار بنیادوں پر قائم ہوگئی - ان قابلِ تعریف کارناموں کے ساتھ ساتھ اکبر کی مذہبی پالیسی اور بے راہ روی نے ملّتِ اسلامیہ کو سخت نقصان پہنچایا۔

دورِ اکبری سے پہلے اگر ہم ہندوستان کی مذہبی حالت کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ مسلمان حکمرانوں، امرا، علما، خصوصاً مشائخ وصوفیہ نے اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں رہ کر اصلاح وتبلیغ کے نمایاں کارنامے انجام دیے۔ اس وقت برصغیر میں مذہب اہل سنت کا عمل دخل اور حنفی فقہ کا رواج تھا۔ کہیں کہیں باطنیوں اور قرامطہ کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی حتی الوسع بیخ کنی کی گئی، چوں کہ ان کا نظام غیر بنیادوں پر تھا، لہذا کہیں کہیں ڈھکے چھپے باقی رہ گئے۔ اثنا عشری تقیہ کی ردا میں پوشیدہ رہے، البتہ بہمنی دور میں وہ ابھرے۔

ہندو معاشرے پر مسلمانوں اور اسلام کا اثر خاصا پڑنے لگا۔ وجہ یہ تھی کہ ہندو معاشرہ ذات پات کی پابندیوں، برہمنوں کے استبداد اور ظاہری رسم ورواج کے جوئے تلے کراہ رہا تھا۔ بہت سے لوگوں کا میلان اسلام کی طرف ہوا۔ یہ بات دیکھ کر ہندوؤں کے بعض ذہین اور ہوشیار مذہبی رہنماؤں نے ذات پات کے بندھنوں کو ڈھیلا کردیا، ظاہری رسم ورواج کو نظر انداز کرنے کا ڈول ڈالا، خدا کی وحدانیت کا ذکر کیا، رام اور رحیم کے نعرے لگانے لگے اور "بھگتی تحریک" کا آغاز کردیا، جو ایک متحدہ مذہب یا معاشرے کا نعرہ تھا۔ رلانند، رلانج وغیرہ اس کے پرچارک تھے۔ بھگتی تحریک ہی سے کرشن بھگتی اور رام بھگتی کے سوتے پھوٹے کبیر پنتھی، دودا پنتھی اور گرونانک جیسے صلح کل اور ان کے مذہبی فرقے وجود میں آئے۔ ان فرقوں میں وحدت الوجود کے نظریات کی چھاپ بھی نظر آتی ہے۔

۹۰۷ھ میں سنبھل میں سکندر لودی بادشاہ کی موجودگی میں بھگتی تحریک کے ایک برہمن بودھن نامی سے علمائے اسلام کا ایک مناظرہ ہوا۔ فرشتہ لکھتا ہے:

"علمائے نامی از اطراف طلبیدہ مجلس بحث ترتیب داد، تفصیل اسامی آنہا ایں است کہ عبدالقادر بن شیخ خواجو ومیاں عبداللہ بن الہ داد از تلنبہ، سید محمد بن سعید خاں از دہلی و ملا قطب الدین وملا الہ داد صالح از سرہند وسید امان وسید برہان وسید حسن از قنوج آمدند وجمعے از امرا کہ ہمیشہ

ہمراہ بادشاہ می بودند، مثل صدر الدین قنوجی و میاں عبدالرحمان ساکن سیکری و میاں عزیز اللہ سنبھلی ایشاں نیز درآں معرکہ حاضر شدند۔ اتفاق علما بر آں شد کہ او را محبوس ساختہ عرض اسلام باید نمود اگر ابا کند باید گشت، بودھن ابا نمودہ کشتہ شد"۔[۱]

اسی زمانے میں سید محمد جون پوری نے " انا المہدی " کا نعرہ بلند کیا اور مہدویت کا علم لہرایا۔ اس میں بھی مسلم معاشرے میں دراڑیں پڑیں۔ اس کا اثر گجرات و دکن تک پہنچا۔ بعض حکمران اور امرا بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے۔ آخر ۹۱۱ھ میں فرہ (افغانستان) میں جا کر سید محمد جون پوری کا انتقال ہوا۔

اکبری عہد میں پیر روشنائی کا ہنگامہ برپا ہوا۔ ایک شخص بایزید انصاری جو جالندھر میں پیدا ہوا تھا، افغانوں کا مقتدا بن بیٹھا، اس نے بہت سے پٹھان مرید کر لیے، اپنی بے دینی اور بدمذہبی کو رونق دی۔ ایک کتاب خیر البیان لکھی جس میں اپنے عقائدِ فاسدہ کو ترتیب دیا۔ اس مذہبی تحریک نے آخر میں سیاسی صورت اختیار کر لی اور مغل حکومت سے ٹکر کر لی۔ روشنیہ تحریک پر بھی وحدت الوجود کے اثرات نمایاں تھے۔

اکبر کے ذکر سے پہلے ہم دورِ ہمایوں کے سلسلے میں دو ایک باتیں عرض کرنی ضروری سمجھتے ہیں۔

ہمایوں جب ایران پہنچا تو شاہ ایران طہماسپ اس شرط پر مدد دینے کے لیے تیار ہوا کہ وہ شیعہ مذہب اختیار کر لے۔ چنانچہ ہمایوں نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا۔ ہمایوں بادشاہ کے ملازم خاص جوہر آفتابچی نے یہ واقعہ خاصی تفصیل سے لکھا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"(ہمایوں) بادشاہ نے فرمایا کہ ہم دل و جان سے ائمہ معصومین علیہم السلام کے تابع و پیرو ہیں۔ اس پر قاضی جہاں نے شاہ عالم پناہ شاہ طہماسپ کے لکھے ہوئے تین خط نکالے اور دو خط بادشاہ ہمایوں کے پاس چھوڑ دیے۔ بادشاہ ان کو پڑھ کر کھڑے ہو گئے اور خیموں کے باہر دروازے پر آ کر بلند آواز سے دشمنانِ رسالت و ولایت و امامت پر لعنت کرنے لگے۔ اس وقت تیسرے کاغذ کو شاہ عالم پناہ نے نسخو لے کر حضرت (ہمایوں) کو دیا۔ انھوں نے شاہ عالم پناہ کی موجودگی میں اس کو پڑھا اور مذہب برحق امام

---

[۱] تاریخ فرشتہ، ص ۱۸۲

اثنا عشریہ اختیار کیا"۔[۵۲]

اسی زمانے میں ہمایوں نے مندرجہ ذیل رباعی کہی :

ما ایم زجاں بندۂ اولادِ علی ہستیم ہمیشہ شاد بایادِ علی
چوں سرِ ولایت از علی ظاہر شد کردیم ہمیشہ ورد خود نادِ علی[۵۳]

۔ بیرم خانِ خاناں، ہمایوں بادشاہ کا معتمد علیہ وزیر اور کارگزار تھا، وہ بھی ان ہی افکار کا حامل تھا۔ اس کے دو شعر پڑھیے :

شہے کہ بگزرد زِ سپہر افرِ او گر غلامِ علی نیست، خاک برسرِ او
محبت شہِ مرداں، مجو زِ بے پدرے کہ دستِ غیر گرفتست پائے مادرِ او[۵۴]

یہاں شاید ایک واقعہ نقل کرنا خالی از دلچسپی نہ ہو۔ شیخ حمید سنبھلی، اس دور کے ایک ممتاز عالم اور مفسرِ قرآن تھے۔ ہمایوں ان کا بہت معتقد تھا۔ انھوں نے ایک دن نہایت صفائی سے بادشاہ سے کہا :

شیخ حمید : بادشاہم تمام لشکر شمارا رافضی دیدم

ہمایوں : شیخ چرا ہم چنیں می گوئید ؟ وچہ قصہ است ؟

شیخ حمید : در ہر جا نام لشکریاں شما دریں مرتبہ ہمہ یار علی، مہر علی، کفش علی وحیدر علی یافتم وہیچ کس نماندیدم کہ بنام یارانِ دیگر (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) باشد۔

ہمایوں یہ سن کر ناراض ہوگیا اور محل میں چلا گیا، مگر پھر آ کر ملائمت سے شیخ کو سمجھا دیا[۵۵]

شمس العلما محمد حسین آزاد لکھتے ہیں :

"وہ شیخ موصوف نے بھی سچ کہا تھا، ہمایوں کے اکثر ہمراہیوں کے نام ایسے ہی تھے، بلکہ گدا علی،

---

۵۲ تذکرۃ الواقعات (اردو)، ص ۱۰۰

۵۳ ایضاً، ص ۱۰۵

۵۴ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ)، ص ۲۱۴

۵۵ دربارِ اکبری، ص ۸۰۸

مسکین علی ، زلف علی ، پنجہ علی ، درویش علی ، محب علی وغیرہ نام جو جا بجا تاریخوں میں آتے ہیں ، وہ انھوں نے نہیں لیے ۔ یہ لوگ بابر کے ساتھ ایران سے آئے ہوں گے یا ہمایوں کے ہمراہ ہوں گے ۔ ہزارہ جات ، کابل کے لوگ بھی تمام شیعہ ہیں [۵۶]

اب ہم اکبر بادشاہ کی بے راہ روی اور الحاد کا ذکر کرتے ہیں ۔ شروع میں اکبر ایک خوش عقیدہ اور با عمل مسلمان تھا ، وہ اگرچہ پڑھا لکھا نہ تھا ، لیکن اس کو علمی و ادبی معاملات سے گہری دلچسپی تھی ۔ اس کی خوش عقیدگی کے سلسلے میں ایک واقعہ کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا ۔ ایک مرتبہ وہ ایسے کپڑے پہن کر مجلس میں آیا جو شرعی نقطۂ نظر سے اچھے نہیں سمجھے جاتے تھے ۔ عبدالنبی صدر الصدور نے اس کے دامن کو چھڑی سے جھٹک کر اعتراض کیا ۔ ظاہر ہے ایک حکمران کی حیثیت سے یہ بات توہین آمیز تھی ، لیکن اکبر نے وہاں کچھ نہ کہا مگر اس کو احساس ہوا ، اور اس نے اپنی ماں سے شکایت کی ۔ اس واقعہ کو ذہن میں رکھ کر اب پندرہ بیس برس کے مابعد حالات پر غور کیجیے ۔ شاہی دربار میں شیخ مبارک اور اس کے نہایت قابل بیٹوں شیخ فیضی اور شیخ ابوالفضل کا دور دورہ ہے ۔ بادشاہ کے حضور میں مخصوص مجلسیں منعقد ہوتی ہیں ۔ رفتہ رفتہ ان مجالس میں غیر مسلم مذہبی رہنما بھی شرکت کرتے ہیں ۔ کھلے عام اظہار خیال ہوتا ہے ۔ اسلام کے استہزا اور تخفیف تک نوبت پہنچتی ہے ۔ شعائر اسلامی کا مذاق اڑایا جاتا ہے ۔ شیخ مبارک اور شیخ ابوالفضل ایک سازش کی بنیادیں رکھتے ہیں اور اس کو روبہ عمل لانے کے لیے بادشاہ کو جال میں پھانسا جاتا ہے ۔ خوشامد اور تملق کا کامیاب نسخہ استعمال کیا جاتا ہے اور ایک مطلق العنان حکمراں کے لیے یہ نسخہ نہایت کامیاب ثابت ہوتا ہے ۔ اکبر کو بات ذہن نشین کرادی گئی کہ وہ صرف شہنشاہ ہی نہیں بلکہ ہادی دین اور امام عادل بھی ہے اس منصوبے پر نہایت ہوشیاری سے عمل کیا گیا ، اسلام کی مخالفت کی گئی لیکن اس طور پر کہ راز جلد افشا نہ ہو اور عوام الناس آسانی سے شکار ہو جائیں ۔ اسلام مجازی کی ایک نئی اصطلاح تراشی گئی ۔ رسالت کو نظر انداز کر کے توحید پسند قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ ہر مذہب

---

[۵۶] دربار اکبری ، ص ۸۰۹

میں کچھ اچھی باتیں ہوتی ہیں، ان سب کو جمع کر کے ایک نیا دین قائم کیا جائے۔ اس سلسلے میں پہلا قدم یہ تھا کہ شرعی فیصلوں کے معاملے میں بادشاہ اکبر کی حیثیت کو مجتہد سے بھی بڑھا دیا گیا۔ رفتہ رفتہ شعائر اسلام پر حملے ہونے لگے۔ بادشاہ کی ہمت خود کو پیغمبر کہنے کی تو نہ ہوئی اور شاید اس اصطلاح سے اس لیے گریز کیا گیا کہ ہندو اس سے بھڑکیں گے لیکن اکبر بادشاہ کے حاشیہ برداروں نے اس کو پیغمبر سے کچھ زیادہ ہی بڑھا دیا۔ مثلاً اس کے ناموں کو تقدس کا رنگ دینے کے لیے "السلام علیکم" کی بجائے "اللہ اکبر" کہا جانے لگا اور جواب میں "جل جلالہٗ" کہا جاتا تھا، داڑھیاں منڈوانے کی ہمت افزائی کی گئی۔ محل کے احاطے میں اذان ممنوع قرار دے دی گئی۔ شراب خوری کو مستحسن اور گوشت خوری کو مذموم سمجھا جانے لگا۔ سورج کی پرستش اعلانیہ کی جاتی تھی۔ اکبر خود بھی اس میں دلچسپی لیتا تھا۔ آتش پرستی کے احترام میں یہ حکم دے دیا تھا کہ محل میں ہر وقت آگ جلتی رہے۔ اس کا اثر بادشاہ پر کس حد تک تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ دن کے وقت وہ اس کمرے میں پہنچا جہاں ایک شخص کو متعین کیا گیا تھا کہ ہر وقت شمع روشن رکھے۔ اتفاق سے وہ سو رہا تھا اور شمع گل تھی۔ اکبر نے اس قصور پر اس کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل کر دیا۔ اسلامی تعلیمات کے وقار پر سب سے کاری ضرب یہ لگائی گئی کہ بادشاہ کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس نئے دین میں سورج، چاند، ستاروں اور آگ تک کا احترام تھا مگر رسالت کو کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ ابوالفضل کی یہ ہمت تو نہ ہوئی کہ اکبر کو نبوت پر فائز کر دیتا لیکن اس کے روحانی کمالات اور مافوق الفطرت خوارق و کرامات کے ذکر سے اکبر نامہ اور آئینِ اکبری کے متعدد صفحات رنگ دیے ہیں۔ مسلمان اپنے ایمان کا کمال یہ سمجھتے ہیں کہ وہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی جان سے زیادہ محبت کریں۔ ابوالفضل کا جوابی فارمولا سنیے کہ دینِ الٰہی میں داخل ہونے والوں کے چار درجے مقرر کیے گئے۔

۱۔ وہ جو بادشاہ پر مال قربان کر سکتے ہیں۔

۲۔ وہ جو جان قربان کر سکتے ہیں۔

۳۔ وہ جو عزت قربان کر سکتے ہیں۔

۴- اعلیٰ درجہ یہ تھا کہ اپنا دین قربان کر دے۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے مختلف اقدامات کیے گئے جن کا ذکر یہاں ممکن نہیں۔ ان کے علاوہ ایسے طریقے بھی استعمال کیے گئے تھے جن سے مسلمانوں کے جذبات کو صدمہ پہنچے، مثلاً بادشاہ کا ماتھے پر تلک لگانا، بسنت منانا اور اس موقع پر رنگے ہوئے کپڑے پہن کر دربار میں آنا۔ ہندو تیوہاروں کو دھوم دھام سے منانا وغیرہ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سارے اقدامات سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے کیے گئے تھے اور ہندوؤں کو سلطنت سے قریب لانے کی یہ تدابیر تھیں۔ اس نظریے پر مورخین میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے کہ دینِ الٰہی کا مقصد کس حد تک سیاسی تھا، لیکن اس میں ذرا برابر شک کی گنجائش نہیں کہ اکبر کی اس پالیسی اور ابوالفضل کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ شریعت کے اقتدار کو سخت صدمہ پہنچا، لوگ شرعی قوانین کی طرف سے غافل ہو گئے اور اس دور میں اسلام کی خوب مضحکہ خیزی ہوئی۔

اکبر کا جب آخری وقت آیا تو بعض دردمند امرا و زعما کو تشویش ہوئی، کیوں کہ اکبر اپنے بیٹے جہاں گیر سے ناراض تھا اور اس کا رجحان اپنے پوتے خسرو کی طرف تھا جو راجا مان سنگھ کا بھانجا اور آصف خاں کا داماد تھا، لہٰذا مسلمانوں کو فکر ہوئی کہ اگر ایسا ہو گیا تو پھر کیا ہوگا۔ مگر امرا کی کوششیں بارآور ہوئیں اور جہاں گیر تخت نشین ہو گیا۔ جہاں گیر کا بھی اپنا انداز تھا۔ اکبری الحاد کو تو قدغن لگ گئی مگر اب ایک نئے فتنے نے سر اٹھایا اور وہ ایرانی اثر و رسوخ کا فتنہ تھا۔ نور جہاں، ملکۂ جہاں گیر بنی اور اس خاتون نے دیکھتے ہی دیکھتے فرماں روائی اور فرمان دہی کے اختیارات سنبھال لیے۔ مرآۃ العالم کا بیان ہے:

من سلطنت را بنور جہاں دادم۔ بجز یک سیر شراب و نیم سیر گوشت، مرا ہیچ نمی باید

نور جہاں کا باپ غیاث الدین تہرانی وکیل السلطنت بنا اور اس کا بھائی آصف خاں وزیرِ اعظم کے عہدے پر فائز ہوا۔ نور جہاں شاہی محلات کے اندر بڑے اختیارات کی مالک ٹھہری، اسی طرح نور جہاں کے اکثر رشتے دار بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ نور جہاں کے افکار و نظریات کی خوب ترویج و اشاعت ہونے لگی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ شہر سامانہ میں عید قربان کی نماز کے موقع پر خطبے میں خلفائے راشدین کے نام نہیں پڑھے گئے۔ حضرت مجدد الف ثانی

لکھتے ہیں :

" شنیدہ شد کہ خطیب آن مقام در خطبۂ عید قربان ذکر خلفائے راشدین را ترک کردہ و اسامی متبرکہ ایشان را نخواندہ، و نیز شنیدہ شد کہ چون جمعے با معترض نمودند بسہو و نسیان خود اعتذار ناکردہ متمرد نشدہ و نیز شنیدہ کہ اکابر و اہالی آن مقام دریں باب مساہلہ ورزیدند و لشدت و غلظت باں خطیب بے انصاف پیش نیامدند۔"

اس خط میں مجدد صاحب نے کچھ ایسا اشارے کیا ہے کہ یہ بدعت کشمیر میں بھی تھی۔ لکھتے ہیں :

" آن (خطیب) بے حقیقت کہ بکشمیریت منسوب است، این خبث را از مبتدعانِ کشمیر اخذ کردہ باشد "

ان حالات میں حضرت مجدد الف ثانی نے اصلاح و تبلیغ کے کارنامے انجام دیے اور ایک تحریک برپا کر دی۔

---

# سید جمال الدین افغانی ـــــــ حیات و افکار

شاہد حسین رزاقی

سید جمال الدین افغانی کا شمار ان چند نادرۂ روزگار افراد میں ہوتا ہے جو مشرق و مغرب کے ذہنی افکار کے رمز شناس تھے اور جنھوں نے دنیائے اسلام کے مسلمانوں میں ملی بیداری، سیاسی شعور اور قومی آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ازحد جدوجہد کی۔ افغانی کے بارے میں یہ کہنا چاہیے کہ وہ اپنی مسلسل مساعی کی بنا پر عالمِ اسلام کی نشأۃِ جدیدہ کے صحیح معنوں میں معمار تھے۔ ان کا زمانہ مغربی استعمار کے عروج اور اسلامی دنیا کے زوال کا زمانہ تھا اور اس کا انھیں انتہائی قلق تھا جو انھیں کہیں چین نہیں لینے دیتا تھا۔

اس کتاب میں ان کی سعی و کوشش اور تگ و تاز کی تفصیلات ترتیب اور عمدہ انداز سے بیان کی گئی ہیں۔

صفحات ۴۸ + ۲۰۸ قیمت ۲۵ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور